حدیث تخلیق - ایک مطالعہ

مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

شعبۂ تحقیق واشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149

H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001

Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

فہرست حدیث تخلیق - ایک مطالعہ

حدیث تخلیق - ایک مطالعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث تخلیق-ایک مطالعہ

﴿عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قَالَ : أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِیْ ، فَقَالَ:خَلَقَ اللّٰهُ التُرْبَةَ يَوْمَ السَّبْتِ وَخَلَقَ فِيْهَا الْجِبَالَ يَوْمَ الْأَحدِ وَخلَقَ الشَّجَرَ يَوْمَ الْإِثْنَيْنِ وَخلَقَ الْمَكْرُوْهَ يَوْمَ الثُلاثَاءِ وَخلَقَ النُّوْرَ يَوْمَ الْأَرْبعَاءِ وَبَثَّ فِيهَا الدَّوَابَّ يَومَ الْخَمِيْسِ وَخَلَقَ آدَمَ بَعْدَ الْعَصْرِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فِيْ آخِرِالخَلْقِ فِی سَاعَةٍ مِنْ سَاعَاتِ الْجُمُعَةِ فِيمَا بَيْنَ العَصْرِ إِلَی اللَّيْلِ﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو سنیچر کے دن پیدا کیا، اس میں پہاڑ اتوار کے دن پیدا کئے ، درخت کو پیر کے دن پیدا کیا، مکروہ چیزوں کو منگل کے دن بنایا، نور کو بدھ کے دن بنایا، زمین میں جانوروں کو جمعرات کے دن پیدا کیا اور آدم علیہ السلام کو سب مخلوق سے آخر میں جمعہ کے دن عصر کے بعد، جمعہ کی ساعات میں سے عصر سے رات تک کے درمیان میں پیدا فرمایا۔

تخریجِ حدیث

یہ حدیث متعدد کتبِ حدیث میں مروی ہے ،اس کو امام احمد بن حنبلؒ نے مسند میں، امام مسلم نے صحیح مسلم میں، امام نسائی نے سنن میں، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، بیہقی نے سنن کبری میں، طبری نے اپنی تفسیر میں، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اس حدیث کو بطریق حجاج بن محمدعن

ا بن جریج عن اسماعیل بن امیه عن ایوب بن خالد عن عبدالله بن رافع عن ابی هریرة، روایت کیا ہے، اورابوالشیخ نے ''العظمۃ'' میں دوطرق سے: ایک وہی جو مذکور ہوا اور دوسرا احمد بن ثور کے واسطے سے ابن جریج سے روایت کیا ہے اور طبرانی نے معجم الاوسط میں محمد بن ثور عن ابن جریج روایت کیا ہے اور یحییٰ بن معین نے اپنی تاریخ میں ھشام بن یوسف کے واسطے سے ابن جریج سے روایت کیا ہے۔(۱)

تحقیقِ سند

اس سند میں تمام راوی ثقہ اور قابلِ احتجاج ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں اس کو درج فرمایا ہے، البتہ بعض حضرات نے اس کے ایک راوی حجاج بن محمد پر کلام کیا ہے، یہ حجاج بن محمد الاعور المصیصی ہیں، ابن حبان نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔(۲)

امام احمد، علی بن المدینی، نسائی، ابوابراہیم السلمی وغیرہ ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے، نیز امام مسلم، عجلی، ابن قانع اور مسلم بن قاسم نے بھی ان کی تعدیل وتوثیق فرمائی ہے۔ البتہ یحییٰ بن معین نے ان پر کلام کیا ہے اور ابوالعرب القیروانی نے ان کو ضعفاء میں شمار کیا ہے، مگر ان پر جو کچھ کلام ہوا ہے وہ ان کے آخر عمر میں تغیر واختلاط کی وجہ سے ہوا ہے، چنانچہ ابن سعد سے امام مزی اور حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ وہ صدوق وثقہ ہیں انشاء اللہ، اور آخر عمر میں انکو جب کہ وہ بغداد

(۱) مسلم: ۲/۱۷۳، مسند: ۲/۳۲۷، سنن کبری نسائی: ۶/۲۹۳، صحیح ابن خزیمہ: ۳/۱۱۷، صحیح ابن حبان: ۱۴/۳۰، مسند ابویعلی: ۱۰/۵۱۳، سنن کبری بیہقی: ۹/۳، تفسیر طبری: ۷/۵، تاریخ بغداد: ۵/۱۸۸، العظمۃ: ۴/۱۳۶۱، معجم الاوسط: ۳/۳۰۳، تاریخ ابن معین: ۳/۵۲ (۲) ثقات ابن حبان: ۸/۲۰۱

آئے، تغیر واختلاط ہو گیا تھا۔(۱)

مگر اس کے باوجود امام مسلم کا اس کو اپنی صحیح میں درج کرنا اس کی علامت ہے کہ حجاج بن محمد کی یہ روایت اختلاط وتغیر سے پہلے کی ہے۔ چنانچہ علامہ نووی نے مسلم شریف میں واقع بعض ضعیف راویوں کی وجہ سے امام مسلم پر جو اعتراض ہوتا ہے، اس کا جواب علامہ ابوعمرو بن الصلاحؒ کی جانب سے نقل کرتے ہوئے، تیسرا جواب یہ دیا ہے:

" الثالث ان يكون ضعف الضعيف الذى احتج به طرأ بعد أخذه عنه باختلاط حدث عليه فهوغيرقادح فيمارواه من قبل فى زمن استقامته"۔

(یعنی تیسرا جواب یہ ہے کہ اس ضعیف راوی کا ضعف جس سے مسلم نے احتجاج کیا ہے، ان کے اس سے حدیث لینے کے بعد اختلاط کی وجہ سے طاری ہوا ہو، پس وہ اس حدیث میں قادح نہیں ہے جو اس سے پہلے زمانۂ استقامت میں انہوں نے روایت کیا ہے)(۲)

اس کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ نے خلال سے نقل کیا ہے کہ حجاج بن محمد کی وہ روایات جو ان کے شاگرد سنید سے آئی ہیں، ان کو چھوڑ کر دوسرے شاگردوں کی روایات ان سے صحیح ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

" إن أحاديث الناس عن حجاج صحاح إلا ما روى سنيد"(بلاشبہ لوگوں کی حجاج سے جو احادیث ہیں وہ صحیح ہیں سوائے اس کے جو سنید نے روایت کی ہیں)(۳)

---

(۱) تہذیب الکمال: ۴۵۴/۵-۴۵۶، تہذیب التہذیب: ۱۸۰/۲ (۲) مقدمہ شرح مسلم نووی: ۱۶
(۳) تہذیب التہذیب: ۲۱۴/۴

اور یہ زیرِ بحث حدیث سنید سے نہیں ہے، بلکہ ان کے دوسرے شاگردوں سے آئی ہے، امام احمدؒ نے اس حدیث کو براہِ راست حجاج سے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے حجاج کے دو ثقہ شاگردوں سے اس کو روایت کیا ہے، ایک سریج بن یونس سے، دوسرے ہارون بن عبداللہ سے۔اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا روایت حجاج کے دوسرے شاگردوں میں سے جلیل القدر ائمہ حدیث امام احمد، سریج بن یونس اور ہارون بن عبداللہ نے روایت کی ہے۔نیز اس حدیث کی روایت میں حجاج بن محمد کی دو حضرات نے متابعت کی ہے ایک ابن معین کے پاس ہشام بن یوسف نے اور ابوالشیخ اور طبرانی کے پاس محمد بن ثور نے، جیسا کہ تخریج حدیث کے تحت عرض کیا گیا۔اور یہ معلوم ہے کہ متابعت کی وجہ سے روایت میں قوت آجاتی ہے، غرض یہ کہ سند کے لحاظ سے یہ روایت صحیح وقابلِ احتجاج ہے۔

حدیث کے متن پر علماء کا کلام

مگر اس کے متن پر علماء نے کلام کیا ہے، کیونکہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کا عمل سنیچر سے شروع ہوکر جمعہ تک ساتوں دن جاری رہا، حالانکہ قرآنِ مجید میں بڑے صاف الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ تخلیقِ کائنات کا عمل صرف چھ دنوں (ستۃ ایام) جاری رہا۔اس مضمون کی آیات قرآن میں کئی جگہ آئی ہیں۔(۱)

ان تمام مقامات پر" ستة أيام" میں تخلیقِ کائنات کا ذکر ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ تخلیق کا عمل ساتوں دن جاری نہیں رہا، لہٰذا علماء محدثین نے حدیثِ زیرِ بحث کے جملہ "خلق الله التربة يوم السبت" (اللہ نے مٹی کو سنیچر کے دن پیدا کیا) کو قرآن کے مخالف ہونے کی وجہ سے غلط قرار دیا ہے اور اس کو کعب احبار

(۱) اعراف:۵۴، یونس:۳، ھود:۷، فرقان:۵۹، سجدہ:۴، ق:۳۸، حدید:۴

کا قول بتایا ہے۔ یہاں اولاً علماء کی چند عبارات نقل کرتا ہوں، پھر ان شاء اللہ العزیز ان پر تبصرہ کروں گا۔

علامہ ابن تیمیہ کی رائے

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

اس حدیث پر امام مسلم سے بھی بڑے علماء نے طعن کیا ہے، جیسے یحییٰ بن معین اور بخاری وغیرہ، امام بخاری نے فرمایا کہ یہ کعب احبار کا کلام ہے اور ایک جماعت نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جیسے ابوبکر ابن الانباری، ابوالفرج بن الجوزی وغیرہ۔ اور بیہقی وغیرہ اس کو ضعیف قرار دینے والوں کی موافقت کرتے ہیں اور یہی صحیح بات ہے؛ کیونکہ یہ تواتر سے ثابت ہے کہ اللہ نے زمین، آسمان اور انکے مابین کی چیزوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور یہ بھی ثابت ہے کہ تخلیق کا آخری دن جمعہ ہے۔ پس لازم ہوا کہ تخلیق کی ابتدا اتوار سے ہو۔۔۔۔۔۔ اور اگر تخلیق کی ابتداء ہفتہ کے دن سے ہو اور انتہاء جمعہ کو ہو تو ساتوں دن تخلیق ہوگی اور یہ قرآن کے خلاف ہے۔(۱)

علامہ ابن القیم کی رائے

علامہ ابن القیم الجوزی نے المنار المنیف میں فرمایا کہ:

"وهو في صحيح مسلم ولكن وقع الغلط في رفعه و إنما هو من قول كعب الأحبار ، كذلك قال إمام أهل الحديث محمد بن إسماعيل البخاري في تاريخه الكبير ، و قاله غيره من علماء المسلمين أيضاً ، وهو كما قالوا لأن الله أخبر أنه خلق السماوات والأرض و ما بينهما في ستة

(۱) مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۸/۱۸

أيام ، وهذا الحديث يقتضي أن مدة التخليق سبعة أيام ، والله أعلم"(یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے لیکن اس کو مرفوع کرنے میں غلطی ہوگئی ،اور یہ تو بس کعب احبار کے کلام میں سے ہے ،امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری نے تاریخ کبیر میں اسی طرح کہا ہے ،اور ان کے علاوہ دیگر علماء نے بھی یہی بات کہی ہے اور حقیقت بھی وہی ہے جو ان حضرات نے بیان کی ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے خبر دی ہے کہ اس نے زمین وآسمان کی تخلیق چھ دن میں کی اور اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ مدتِ تخلیق سات دن ہو)(۱)

علامہ ابن کثیرؒ کی رائے

مشہور مفسر علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں سورہ اعراف کی (آیت:۵۴) کی تفسیر کرتے ہوئے امام احمد، مسلم ونسائی کے حوالے سے مذکورہ بالا حدیث نقل کی ہے، پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

" وفيه استيعاب الأيام السبعة ، والله تعالى قد قال: "في ستة أيام"ولهذا تكلم البخاري وغير واحد من الحفاظ في هذا الحديث ، وجعلوه من رواية أبي هريرة عن كعب الأحبار، وليس مرفوعا"(اس حدیث میں ساتوں ایام کا استیعاب ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ''چھ دنوں میں'' (تخلیق ہوئی ہے) اسی لیے بخاری اور بہت سے حفاظِ حدیث نے اس حدیث میں کلام کیا ہے، اور اس کو ابو ہریرہ کی کعب احبار سے روایت قرار دیا ہے اور یہ مرفوع (یعنی اللہ کے رسول کا قول) نہیں ہے۔(۲)

ملا علی قاریؒ کی رائے

ملا علی القاریؒ موضوعات کبیر میں اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

(۱) المنار المنیف:۸۴-۸۶ (۲) تفسیر ابن کثیر:۲/۲۲۰

یہ حدیث مسلم شریف میں ہے، لیکن اس میں غلطی ہوگئی ہے کہ اس کو مرفوع (یعنی اللہ کے رسول کا قول) بتایا گیا ہے حالانکہ یہ کعبِ احبار کا قول ہے جیسا کہ امامِ حدیث بخاری نے تاریخ کبیر میں اور دیگر علماءِ مسلمین نے بیان کیا ہے۔ اور بات وہی ہے جو ان حضرات نے بیان کی ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آسمانوں، اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزیں چھ دنوں میں پیدا فرمائی ہیں اور حدیث اس معنی کو متضمن ہے کہ تخلیق کی مدت سات دن ہے۔(۱)

علامہ آلوسی بغدادیؒ کی رائے

علامہ آلوسی بغدادیؒ نے روح المعانی میں اس حدیث کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ:

"ولایخفی أن هذا الخبر مخالف للآية الكريمة فهو إما غير صحيح وإن رواه مسلم وإما مؤول " (مخفی نہ رہے کہ یہ حدیث آیتِ کریمہ کے مخالف ہے، لہٰذا وہ یا تو صحیح نہیں ہے، اگرچہ اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے، یا یہ کہ وہ مؤول ہے)۔(۲)

علامہ مناوی کی رائے

علامہ مناوی نے فیض القدیر میں لکھا ہے کہ:

" قال الزركشي: أخرجه مسلم وهو من غرائبه وقد تكلم فيه ابن المديني والبخاري و غيرهما من الحفاظ وجعلوه من كلام كعب الأحبار وأن أبا هريرة إنما سمعه منه، لكن اشتبه على بعض الرواة فجعله مرفوعاً " (علامہ زرکشی نے کہا کہ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے اور یہ مسلم کی غریب احادیث میں سے ہے، اور اس حدیث پر حفاظ حدیث نے کلام کیا ہے اور

(۱) موضوعات کبیر:۱۰۰ (۲) روح المعانی:۱۳۳/۸

اس کو کعب احبار کا قول قرار دیا ہے، اور یہ کہ حضرت ابو ہریرہ نے اس کو کعب احبار سے ہی سنا ہے، لیکن بعض راویوں کو اشتباہ ہو گیا اور اس کو مرفوع قرار دے دیا) (۱)

علامہ رشید رضا مصریؒ کی رائے

مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا مصریؒ نے اپنی تفسیر المنار میں اس حدیث کے متعلق فرمایا ہے کہ ''حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو اس مسئلہ میں سب سے قوی ہے، اس کا متن نص کتاب اللہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ (۲)

ان محدثین ومفسرین کرام کی عبارات سے پتہ چلا کہ ان حضرات نے اس حدیث کو قرآنِ مجید کی آیات کے خلاف ہونے کے خیال سے رد فرمایا ہے۔

فنِ حدیث میں اصولِ درایت کا استعمال

اور یہ دراصل فن حدیث میں اصولِ درایت کے استعمال کا لازمی ولابدی تقاضا ہے، فن حدیث میں جس طرح اصولِ روایت کو کام میں لایا جاتا ہے، اسی طرح درایت سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ان اصول میں سے چند اہم اصول یہ ہیں کہ حدیث قرآن مجید، سنت متواترہ، اور اجماع قطعی کے خلاف نہ ہو۔ (۳)

حضراتِ محدثین نے اس اصول کے پیشِ نظر ان احادیث کا رد کیا ہے جن کا مفہوم قرآن مجید کے نصوص سے معارض معلوم ہوتا ہے۔

مثلاً یہ حدیث جو ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''**لا يدخل ولد الزنا الجنةَ ولا شيءٌ من نسله إلى سبعة آباء**'' (حرامی بچہ جنت میں داخل نہ ہوگا اور نہ اس کی نسل میں سے کوئی سات پشتوں تک جنت میں

(۱) فیض القدیر: ۴۴۸/۳ (۲) تفسیر المنار: ۴۴۹/۸ (۳) نزہۃ النظر: ۶۱، فتح المغیث: ۳۹۶/۱، تدریب الراوی: ۲۷۶/۱، توضیح الافکار: ۹۶/۲

داخل ہوگا) (۱)

محدثین وعلماء جرح وتعدیل نے اس حدیث کوموضوع وباطل قرار دیا ہے۔(۲)

کیونکہ یہ صریح طور پر قرآنی اصول کے خلاف ہے،قرآن نے فرمایا﴿ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزرَاُخریٰ ﴾[النجم:۳۸] (ایک نفس دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا) (۳)

ایک طرف قرآن کا یہ اصول ہے کہ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا، دوسری طرف یہ حدیث بتاتی ہے کہ زنا کار کا بوجھ اس کے بچے پر اوراس بچے کی سات نسلوں پر لادا جائے گا،ظاہر ہے کہ قرآن کے خلاف اس حدیث کوقبول نہیں کیا جا سکتا ہے،لہٰذا اس کورد کردیا گیا۔

بتانا یہ چاہتا تھا کہ محدثین نے روایتی پہلو کے ساتھ درایتی پہلوکو بھی برتا ہے، اسی اصول کے تحت زیرِ بحث حدیث کوعلماء نے رد کردیا ہے کہ یہ قرآنی تصریح کے خلاف ہے۔

ایک اور اصول

لیکن یہ اسی صورت میں قابلِ رد ہے اور ہونا چاہئے جبکہ حدیث کوقرآنی تصریح کے خلاف مانا جائے ،اورمحدثین وعلماء نے جواس کورد کیا ہے وہ بھی اسی بنیاد پر ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے اوراگراس حدیث کی ایسی تاویل ہوجائے جس سے وہ مخالفتِ قرآن کے الزام سے بری ہوجائے تو وہ قابلِ رد نہ رہے گی؛ کیونکہ جس طرح محدثین نے روایت کے مخالفِ قرآن ہونے کی صورت میں اس

(۱)سنن کبری نسائی :۳/۱۷۸،طبرانی فی الاوسط :۱/۳۶۳،مسند عبد بن حمید :۱/۴۲۸ (۲) دیکھو موضوعات ابن الجوزی :۳/۱۱۱، اللالی المصنوعۃ للسیوطیؒ:۲/۱۹۳، کشف الخفاء :۲/۴۵۲ (۳) اس مضمون کی آیات قرآن میں درجِ ذیل مقامات پر وارد ہوئی ہیں:انعام :۱۶۴، اسراء: ۱۵، فاطر: ۱۸،زمر:۷،نجم:۳۸۔

کے قابلِ رد ہونے کا اصول مقرر کیا ہے، اسی طرح انہی حضرات نے یہ اصول بھی بتایا ہے کہ اگر حدیث تاویل کے ذریعہ مخالفتِ قرآن سے نکل جائے تو قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ ایسی حدیث قبول نہیں کی جائے گی جس کا مدلول قرآن سے متصادم ہو وہیں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "حيث لا يقبل شي من ذلك التاويل " (۱)

یعنی وہ قاعدہ واصول اس وقت ہے جبکہ کوئی قابلِ اعتبار تاویل اس میں نہ چل سکتی ہو۔اور علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ : وأما المعارضة مع إمكان الجمع فلا " (لیکن قرآن وحدیث یا اجماع سے معارضہ دونوں میں تطبیق وجمع کے ممکن ہونے کے ساتھ ہوتو یہ موضوع ہونے کی دلیل نہیں)(۲)

اورعلامہ امیر صنعانی نے" توضیح الافکار" میں فرمایا کہ : "وهذا إنما يأتي حيث لا يمكن الجمع بوجه من الوجوه ، أما مع إمكان الجمع فلا " (اور یہ معارضہ کی بات وہاں حاصل ہوتی ہے جہاں دونوں میں کسی بھی طرح سے تطبیق وجمع ممکن نہ ہو،لیکن دونوں میں جمع وتطبیق کے امکان کے ساتھ نہیں ہوسکتی)(۳)

معلوم ہوا کہ اگر کوئی تاویل ایسی اس میں چل جائے جو قابلِ اعتبار ہو،تو پھر وہ حدیث قابلِ قبول ہوجاتی ہے،اوراس صورت میں اس کو موضوع نہیں کہا جائے گا۔خلاصہ یہ نکلا کہ حدیث کا مفہوم ومدلول بظاہر قرآن سے معارض ومتصادم ہے، تو اگراس میں تاویل کی گنجائش نہ ہوتو وہ قابلِ رد ہے اور اگر تاویل کی گنجائش ہوتو مقبول ہے۔

پھر وہ تاویل کا عمل چوں کہ ایک اجتہادی کام ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں

(۱)فتح المغيث:۱/۲۶۹،۳نزهة النظر لابن حجر:۶۱ (۲) تدريب الراوي:۱/۲۷۶(۳)توضيح الافكار:۲/۹۶

اختلاف ہو، بعض کے نزدیک وہ تاویل قابلِ اعتبار نہ ہو، لہٰذا وہ بدستور حدیث کو ناقابلِ اعتبار قرار دیں۔ اور بعض کے نزدیک وہ تاویل قابلِ اعتبار ہو، لہٰذا وہ حدیث کو مقبول قرار دیں۔ نیز ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ حدیث کی کوئی تاویل وتوضیح بعد والے کی سمجھ میں آجائے جب کہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں اس کی کوئی معقول توضیح نہ آئی ہو، اس وجہ سے انہوں نے اس کو رد کر دیا ہو۔

سلفِ صالحین سے نظیریں

چنانچہ اسلافِ کرام میں بھی ایسا ہوا ہے۔ مثلاً

(۱) حضرت عائشہؓ نے حدیث "إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ" (میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے) کو اس لیے رد کر دیا کہ یہ قرآنی اصول ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى﴾ کے خلاف ہے۔ اور فرمایا کہ حضور ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا، بلکہ دراصل آپ ﷺ نے ایک یہودی عورت کو قبر پر روتے دیکھا تو یہ فرمایا کہ یہ رو رہی ہے، حالانکہ میت پر عذاب ہو رہا ہے۔ (۱)

اس کا حاصل یہ ہے کہ "إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ" جو بعض صحابہ جیسے حضرت عمرؓ وابن عمرؓ نے روایت کیا ہے، یہ حضور ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے کچھ اور فرمایا تھا اور سننے والوں نے کچھ اور نقل کر دیا، اس میں ان سے غلطی ہوگئی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت عائشہؓ نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔ (۲)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے اس حدیث کا انکار کیا ہے اور فرمایا کہ کیا کوئی شخص اللہ کے راستے میں شہید ہو جائے اور اس کی بیوی جہالت وحماقت کی وجہ سے اس پر روئے تو کیا اس شہید پر اس بے وقوف عورت کی وجہ سے عذاب ہوگا؟ (۳)

(۱) بخاری: ۱/۲/۱۷۱، مسلم: ۱/۳۰۳، ابوداؤد: ۲/۴۴۶، وغیرہ (۲) دیکھو مسلم: ۱/۳۰۳ (۳) ذکرہ ابن حجر فی فتح الباری بروایۃ ابی یعلی: ۳/۱۵۴

مگر خود حضرت عائشہؓ نے بعض اوقات اس حدیث کی تاویل فرمائی ہے، اورانہوں نے متعدد تاویلات اس کی پیش فرمائی ہیں۔ تفصیل کے لیے مسلم شریف دیکھیں، نیز ابن حجر کی فتح الباری میں بھی ان کی تاویلات کا ذکر ہے، اسی طرح دوسرے علماء نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دے کر اس کی متعدد تاویلات پیش فرمائی ہیں، جس سے یہ حدیث قرآن کے معارضہ سے نکل جاتی ہے۔ (۱)

(۲) نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جس نے یہ گمان کیا کہ محمد ﷺ نے اللہ کو دیکھا اس نے خدا پر جھوٹ باندھا۔ (۲)

اوراس پر وہ آیت ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ وغیرہ سے استدلال فرماتی ہیں ،مگر حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور دیگر اصحاب سے بروایاتِ صحاح ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کو دیکھا ہے اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے ،جیسا کہ علامہ نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے۔

رہا حضرت عائشہؓ کا آیت سے استدلال تو علماء نے اس کے جوابات دئے ہیں اور بتایا ہے کہ حدیث میں صرف دیکھنے کا ذکر ہے، اور آیت جس کی نفی کر رہی ہے، اس سے وہ رویت مراد ہے جو بطور احاطہ کے ہو، لہٰذا تعارض نہیں۔ (۳)

(۳) اسی طرح بعض محدثین نے اس حدیث کو موضوع کہہ دیا جسے بخاری نے الادب المفرد میں، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ثوبان سے اور امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت ابو امامہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ” **لا یؤمّن عبد قوما** ،

(۱) دیکھو شرح مسلم للنووی: ۱/۳۰۲-۳۰۴، فتح الباری: ۳/۱۵۳-۱۵۶ (۲) رواہ مسلم: ۱/۹۸
(۳) فتح الملہم: ۱/۳۳۹، شرح مسلم للنووی: ۱۱/۹۷ وغیرہ

فیخص نفسه بدعوة دونهم ، فإن فعل فقد خانهم "(کوئی بندہ کسی قوم کی امامت کرتے ہوئے ہرگز اپنے نفس کو کسی دعاء میں خاص نہ کرے، اگر ایسا کیا تو اس نے قوم سے خیانت کی)(۱)

اور اس کو موضوع کہنے کی وجہ یہ بتائی کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل کے خلاف ہے جو احادیث سے ثابت ہے؛ کیونکہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اکثر دعائیں صیغۂ مفرد سے واقع ہوئی ہیں، لہٰذا اگر امام کو اپنے لئے دعاء میں تخصیص کرنا قابل نکیر تھا تو خود آپ ﷺ نے کس طرح کیا؟

مگر محقق علماء کی نظر میں محض اس ظاہری معارضہ کی وجہ سے اس حدیث کو موضوع قرار دینا صحیح نہیں، اسی لئے علماء نے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو اس کو موضوع کہتے ہیں، چنانچہ علامہ زرکشی نے" النکت علی ابن الصلاح "میں اور علامہ امیر الصنعانی نے ''توضیح الافکار'' میں اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے ان دونوں حدیثوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے ارشاد سے یہ مراد ہو کہ جو دعائیں احادیث سے ثابت و مشروع نہیں، ان میں اپنے لئے خاص دعاء کا اہتمام قوم سے خیانت ہے۔(۲)

لہٰذا جن احادیث میں امام کو دعاء میں اپنی تخصیص کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن و احادیث میں وارد دعاؤں کے علاوہ اپنی تخصیص نہ کرے، اور قرآن و احادیث میں اگر کوئی دعاء خاص الفاظ کے ساتھ آئی ہے تو وہ منع نہیں ہے۔

(۴) اسی طرح علامہ ابن حبان نے ان احادیث کو موضوع کہا ہے جن میں

---

(۱) ترمذی:۳۵۷، ابو داؤد:۹۰ ، ابن ماجہ: ۹۲۳، احمد:۲۵۰/۵، الادب المفرد:۳۷۵/۱، شعب الایمان:۵۱۸/۷ (۲) النکت علی ابن الصلاح:۲۲۹۲/۲، توضیح الافکار:۹۷/۲

ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیث میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صوم وصال نہ رکھو، صحابہ نے عرض کیا کہ آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں؟ تو فرمایا کہ :"إني لست كأحدكم ، إني أُطعَمُ وأُسقى" (میں تم جیسا نہیں ہوں، مجھے کھلایا اور پلایا جاتا ہے) وہ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ :"هذا الخبر دليل على أن الأخبار التي فيها ذكر وضع النبي ﷺ الحجر على بطنه هي كلها أباطيل ،إذ الله جل و علا كان يطعم رسول الله ﷺ ويسقيه إذا واصل ، فكيف يتركه جائعاً مع عدم الوصال حتى يحتاج إلى شدّ حجر على بطنه ، وما يغني الحجر عن الجوع "(یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جن احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے پیٹ پر پتھر باندھنے کا ذکر ہے وہ سب کی سب باطل ہیں؛ کیونکہ اللہ جل و علا جب صوم وصال رکھنے کے وقت آپ کو کھلاتا و پلاتا تھا تو دوسرے وقت میں کیسے وہ آپ کو بھوکا چھوڑ دیگا، یہاں تک کہ آپ پیٹ پر پتھر باندھنے کے محتاج ہوں جبکہ پتھر کچھ بھوک سے مستغنی کرنے والا بھی نہیں)(۱)

مگر امام ابن حبان نے جو ان احادیث میں تعارض سمجھ کر ایک قسم کی احادیث کو موضوع و باطل کہہ دیا ہے جمہور علماء کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ان دونوں میں تطبیق کی صورت ممکن ہے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ان کی باتوں کا خوب رد کیا ہے اور سب سے زیادہ عمدہ دلیل جس سے ان کا رد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خود ابن حبان نے حضرت ابن عباس سے اپنی صحیح میں حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوپہری کے وقت نکلے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو پوچھا کہ کیوں باہر نکلے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں بھوک نے باہر

(۱) صحیح ابن حبان: ۳۴۴/۸

نکلنے پر مجبور کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! مجھے بھی اسی بھوک نے باہر نکالا ہے''، یہ حدیث ان کے استدلال کا رد کرتی ہے۔(۱)

اور علامہ ذہبی نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں لکھا ہے کہ میں نے حافظ ضیاء کا لکھا ہوا ایک جزء دیکھا جو انھوں نے ابن حبان کے رد میں لکھا ہے، اس میں انھوں نے فرمایا کہ ابن حبان نے حدیث وصال کے بارے میں کہا کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جن احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے پیٹ پر پتھر باندھنے کا ذکر ہے وہ سب کی سب باطل ہیں، میں کہتا ہوں کہ خود انھوں نے حضرت ابن عباس سے حدیث روایت کی کہ ابو بکر وعمر بھوک کی وجہ سے باہر نکلے اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی تو کہا کہ بھوک نے ہم کو نکالا ہے، اور آپ نے بھی کہا کہ مجھے بھی اسی بات نے نکالا جس نے تم کو نکالا ہے، پس یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ کو صرف صوم وصال کے وقت کھلایا اور پلایا جاتا تھا۔(۲)

اس کے ساتھ جمہور نے ابن حبان کے جواب میں دونوں قسم کی احادیث کی جمع وتطبیق کی یہ صورت بھی لکھی ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ کو روزے کی حالت میں کھلائے جانے اور پلائے جانے سے مراد یہ ظاہری کھانا اور پینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد روحانی غذا ہے جو اللہ کی عظمت وجلالت میں تفکر، اس کے مشاہدہ میں غوطہ زنی، اس کی معرفت میں غرق ہوجانے، اس کی محبت کے نشہ میں مستی، اس سے مناجات میں استغراق اور اس کی طرف توجہ وانابت میں کمال سے حاصل ہوتی ہے، اور یہ وہ غذا ہے جو انسان کو جسمانی وظاہری غذاؤں سے بے نیاز کردیتی ہے۔ لہٰذا ظاہری غذا سے بے نیازی کے ساتھ جسمانی طور پر بھوک کا پایا جانا کوئی مستبعد بات

(۱) فتح الباری: ۲۰۸/۴ (۲) سیر اعلام النبلاء: ۹۸/۱۶

نہیں؛ کیونکہ حضرات انبیاء کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں: ایک جہت تجرد، ایک جہت تعلق ، پس پہلی جہت کے لحاظ سے یہ حضرات ان باتوں سے محفوظ ہوتے ہیں جو عام انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں جیسے ضعف، بھوک، پیاس، کمزوری وغیرہ، اور دوسری جہت کے لحاظ سے دیکھیں تو ظاہراً یہ سب باتیں ان کو لاحق ہوتی ہیں، اس لئے ان کے ظاہر تو بشر ہوتے ہیں جن کو یہ ظاھری آفات لاحق ہوتی ہیں مگر ان کے باطن ربانی ہوتے ہیں جو اللہ تعالی سے مناجات کی لذت پا کر غذا حاصل کرتے ہیں۔(۱)

غرض یہ کہ جس حدیث کا مفہوم و معنی بظاہر قرآن و حدیث یا اجماع کے معارض و مخالف ہو، اس کو اگر تاویل کے ذریعہ معارضہ سے نکالا جا سکتا ہو تو اس حدیث کا اعتبار کرنا چاہئے۔

حافظ ابن حجرؒ کا ارشاد

یہاں حافظ ابن حجرؒ کا ایک ارشاد ذہن نشین ہونا چاہئے، وہ علامہ ابن الجوزیؒ کے ایک حدیث کو اس بنا پر رد کرنے پر کہ وہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی ایک حدیث سے معارض ہے، رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ولاينبغي الإقدام على الحكم بالوضع إلا عند عدم إمكان الجمع ، ولايلزم من تعذر الجمع في الحال أن لايمكن بعد ذلك".

(حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگانے پر اقدام اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے کہ دونوں (متعارض حدیثوں) میں تطبیق ناممکن ہو جائے، اور فی الحال تطبیق کے متعذر رہونے سے یہ لازم نہیں کہ بعد کے زمانے میں بھی ناممکن ہو)۔(۲)

یہ بات جس طرح دو متعارض حدیثوں کے بارے میں ہے، اسی طرح

(۱) دیکھو: زادالمعاد: ۳۰/۲، فتح الباری: ۲۰۸/۴، زرقانی علی المؤطا: ۲۴۳/۲، فیض القدیر: ۱۲۴/۳

(۲) القول المسدد: ۱۷

دوآیات یاایک حدیث اورایک آیت کے مابین تعارض کی صورت میں بھی بطوراصول وقاعدے کےمسلم ہوناچاہئے جیسا کہ ظاہر ہے۔

حدیثِ زیر بحث اورآیت میں تطبیق کی صورت

اس اصول کے پیشِ نظرزیرِ بحث حدیث اورآیتِ مذکورہ (جس میں چھ دن میں تخلیق کا ذکر ہے) کے مابین کوئی صورتِ تطبیق نکل آئے، تواس حدیث کے اعتبارکرنے میں کوئی تامل نہ ہوناچاہئے ،اگرچہ تطبیق کی صورت نہ پا کراس کو پہلے حضرات نےقبول نہ کیاہو۔

راقم الحروف نے ایک مطالعہ کے دوران محسوس کیا کہ حدیثِ زیرِ بحث آیتِ مذکورہ سے معارض نہیں ہے، اور دونوں میں تطبیق ہوسکتی ہے اور تطبیق بھی تکلف وتعسف پرمبنی نہیں بلکہ بلاتکلف وتعسف قابلِ فہم ہے۔

میں اپنے اس مطالعہ کا خلاصہ یہاں پیش کررہاہوں تاکہ علماءکرام اس پر غورفرمائیں اوراپنی رائے کااظہارفرمائیں۔ مجھےاس پراصرارنہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک طالب علمانہ معروضہ ہےجس کومیں اسی حیثیت سے پیش کررہاہوں۔

فی ستۃ ایام کی تفسیر

حدیث پرغورکرنے سے پہلے، آیتِ کریمہ جس میں چھ دنوں میں تخلیقِ کائنات کا ذکرہے،اس میں غورکرلیناچاہئے۔اس آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ”فی ستة أيام“(چھ دنوں میں) سے کیامراد ہے؟

جمہورمفسرین نےلکھاہے کہ یہاں ”یوم“ (دن) سےمرادمتعارف دن نہیں ہے؛ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات کوپیدافرمایاتواس سے پہلے سے دنوں کا یہ متعارف نظام جیسا کہ ظاہرہے قائم نہیں تھا، بلکہ انہی چھ دنوں کی مدت میں اس کانظام بھی قائم ہواہے۔لہٰذایہاں ”ستتة أيام“ سےمرادمتعارف دن نہیں ہیں۔

امام ابن جریر طبری نے اس پر تاریخ میں تفصیلی کلام کیا ہے، انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جو فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ جن چھ دنوں میں اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا ان میں سے ہر دن کی مقدار دنیوی ایام کے لحاظ سے ایک ہزار برس کے برابر تھی، نہ کہ ہمارے ان متعارف ایام کے برابر؟ جبکہ اللہ تعالی نے یہ نہیں بتایا کہ اس سے اخروی چھ دن مراد ہیں بلکہ اللہ تعالی نے تو یہ کہا ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان اور ان کے ما بین کی چیزوں کو ''چھ ایام'' میں پیدا کیا اور اس کے مخاطبین کے نزدیک ایام سے وہی ایام مراد ہیں جن میں سے ہر ایک طلوع فجر سے غروب شمس تک ہوتا ہے، اور یہ مسلم ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں بندوں سے جو خطاب کیا ہے وہ اس کے زیادہ مشہور و معروف معنی کی جانب پھیرا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں عقل سے استنباط کے بجائے احادیث و آثار پر اعتماد کیا ہے کیونکہ ان میں سے اکثر امور گزشتہ کی خبریں ہیں اور یہ محض عقل سے استنباط کرنے سے معلوم نہیں ہو جاتیں اور ہمارے علم میں ائمہ دین میں سے کوئی نہیں جو اس کے خلاف کا قائل ہو، پھر اس بارے میں بعض روایات بھی مروی ہیں جیسے عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا کہ اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق چھ دن میں کی اور ان میں سے ہر دن تمہارے دنوں کے لحاظ سے ایک ہزار برس کے برابر تھا، اسی طرح ضحاک سے بھی روایت ہے اور حضرت کعب و حضرت مجاہد نے بھی فرمایا کہ ہر دن ایک ہزار برس کے برابر تھا۔ (۱)

امام بغویؒ اپنی تفسیر معالم التنزیل میں فرماتے ہیں:

" أراد به فی مقدار ستة أيام ؛ لأن اليوم من لدن طلوع الشمس إلى غروبها ، ولم يكن يومئذ يوم ولا شمس ولا سماء "(یعنی ستۃ أیام سے

(۱) ملخصاً من تاریخ الطبری: ۱/۴۲-۴۳

چھ دنوں کی مقدار مراد لی ہے؛ کیوں کہ دن طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہوتا ہے اور اُس وقت نہ دن تھا، نہ سورج، نہ آسمان)(۱)

اور علامہ محمود آلوسی بغدادیؒ سورہ یونس آیت:۴ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ولایمکن أن یراد بالیوم الیوم المعروف لأنه کما قیل: عبارة عن کون الشمس فوق الأرض، وهومما لایتصور تحققه حین لا أرض ولاسمآء" (دن سے متعارف دن مراد لینا ممکن نہیں؛ کیونکہ دن جیسا کہ کہا گیا ہے نام ہے سورج کے زمین کے اوپر ہونے کا، اور جب نہ زمین تھی اور نہ آسمان، اس وقت اس کے تحقق کا تصور نہیں ہوسکتا)(۲)

علامہ رشید رضا مصریؒ فرماتے ہیں:

"ولایعقل أن تکون هذه الأیام الستة من أیام أرضنا التی یحدد لیل الیوم ونهاره منها بأربع وعشرین ساعةً من الساعات المعروفة عندنا، فإن هذه الأیام إنما وجدت بعد خلق هذه الأرض، فکیف یکون أصل خلقها فی أیام منها۔" (یہ بات معقول نہیں ہے کہ چھ دن ہماری زمین کے ان چھ دنوں میں سے ہوں جن میں سے ایک دن ورات کو چوبیس گھنٹوں سے محدود کیا جاتا ہے جو ہمارے پاس معروف ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ چھ دن بھی اس زمین کی تخلیق کے بعد موجود ہوئے ہیں تو زمین کی تخلیق انہی دنوں میں کیسے ہوسکتی ہے؟)(۳)

ان تمام عبارات کا حاصل یہی ہے کہ آیت میں "ستة أیام" سے مراد یہ معروف ومتعارف دن نہیں ہیں، ان کا یہاں مراد لینا معقول وصحیح نہیں۔

پھر ان سے کیا مراد ہے؟ ان حضرات نے بتایا ہے کہ مراد مطلق وقت ہے جو چھ دنوں کی مدت کے برابر تھا۔(۴)

(۱) معالم التنزیل:۱۶۴/۲ (۲) روح المعانی:۶۴/۱۱ و۴/۱۲ (۳) تفسیر المنار:۴۴۵/۸ (۴) دیکھو معالم التنزیل:۱۶۴/۲، روح المعانی:۶۴/۱۱ وغیرہ

اس کے بعد یہاں یہ بھی واضح ہو کہ اکثر علماءِ تفسیر نے (چھ دنوں کی مدت) سے بھی دنیوی چھ دنوں کی نہیں بلکہ آخرت کے چھ دنوں کی مدت مراد لی ہے، جس کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ امام ابوجعفر الطبریؒ نے اسی قول پر اکتفاء کیا ہے اور حضرت مجاہدؒ سے اس کو نقل کیا ہے۔ اور تفسیر ابن عباسؓ میں ہے کہ چھ دنوں میں سے ہر ایک دن کا طول ایک ہزار برس ہے۔(۱)

علامہ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"واختلفوا في هذه الأيام هل كان كل يوم منها كهذه الأيام كما هوا المتبادر إلى الأذهان ، أو كل يوم كألف سنة كما نص على ذلك مجاهد والإمام أحمد ، ويروى ذلك من رواية الضحاك عن ابن عباس."

(ان چھ دنوں کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ کیا ان میں سے ہر دن ان متعارف دنوں کی طرح تھا جیسا کہ ذہنوں کی طرف یہی متبادر ہوتا ہے، یا ہر دن ایک ہزار برس کی مانند تھا؟ جیسا کہ مجاہد اور امام احمد نے تصریح کی ہے، اور یہ بات ضحاک کی روایت سے ابن عباس سے مروی ہے)۔(۲)

علامہ ابن الجوزی نے اپنی تفسیر "زاد المسیر" میں لکھا ہے کہ:" قال ابن عباس : مقدار كل يوم من تلك الأيام ألف سنة ، و به قال كعب و مجاهد و الضحاك ، ولا نعلم خلافاً في ذلك "(ابن عباس نے کہا کہ ان چھ دنوں میں سے ہر دن کی مقدار ایک ہزار سال کے برابر تھی، اور یہی حضرت کعب، مجاہد اور ضحاک کا قول ہے، اور ہم اس میں کسی کا اختلاف نہیں جانتے)(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ علماء میں اگرچہ اختلاف ہے جیسا کہ ابن کثیر نے فرمایا،

(۱) تفسیر طبری: ۱۴۶/۵، تفسیر ابن عباس علی ہامش الدر المنثور: ۹۹/۲ (۲) تفسیر ابن کثیر: ۲۲۰/۲
(۳) زاد المسیر: ۲۱۱/۳

مگرزیادہ ترعلماء نے ان چھ دنوں سے آخرت کے چھ دن مراد لیے ہیں۔اور یہی قول حضرت ابن عباسؓ ،حضرت مجاہد، امام احمد اورضحاک وغیرہ سے مروی ہے، جیسا کہ ابن کثیر وطبری وابن الجوزی کی عبارتوں سے واضح ہے۔

نیز امام قشیری کا بھی یہی قول ہے اور جدید مفسرین میں سے علامہ رشید رضا مرحوم نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔اسی طرح حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے۔(۱)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ ”ستة أيام“ سے مراد یہ متعارف دن نہیں ہیں اور یہ کہ اس سے مراد چھ دنوں کی مقدار ہے، اور دن سے بھی جمہور کے نزدیک آخرت کے دن مراد ہیں ،جن میں سے ہر دن کی مقدار ایک ہزار برس کے برابر ہے۔جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: ﴿كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [سجدہ:۵] اس طور پر ان آیات کا جن میں تخلیق کائنات کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ مطلب ہوا کہ ”اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان اوران کے مابین کی سب چیزوں کو دنیوی دنوں کے اعتبار سے چھ ہزار سال میں پیدا فرمایا“۔اور یہی مطلب جدید سائنسی انکشافات وتحقیقات کے مطابق ہے ۔جیسا کہ جدید سائنس کے ماہرین نے بتایا ہے۔(۲)

حدیثِ پاک کی تشریح

جب آیت کا مطلب واضح ہوگیا تو اب حدیث پاک کی تشریح وتوضیح کی طرف توجہ فرمائیں تاکہ آیت وحدیث میں تعارض وتخالف نہ ہونا واضح طور پر معلوم ہوسکے۔

(۱) دیکھو:تفسیر قرطبی :۲۱۹/۷،تفسیر المنار: ۴۴۵/۸، معارف القرآن:۵۷۲/۳ (۲) دیکھو ڈاکٹر موریس کی کتاب ”بائبل قرآن اور سائنس: ۱۳۸-۱۴۵

(۱) حدیثِ زیرِ بحث میں سب سے پہلی بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اس میں جو دن گنائے گئے ہیں، وہ متعارف دن ہیں یا وہ جن کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے؟

اگر ان سے وہ دن مراد لیے جائیں جو قرآن میں مذکور ہیں تو بیشک قرآن سے معارضہ لازم آئے گا کہ قرآن چھ اخروی دنوں میں کائنات کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے جب کہ یہ حدیث سات اخروی دنوں میں تخلیق کا ہونا بیان کرتی ہے۔ حضراتِ علماء ومحدثین کرام نے عموماً حدیثِ مذکورہ میں وہی دن مراد لے کر جس کا قرآن میں ذکر ہے، تعارض محسوس فرمایا ہے اور پھر اسی کی وجہ سے اس حدیث پر طعن فرمایا ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حدیث میں جو دن گنائے گئے ہیں، ان سے ہمارے متعارف ایام مراد لینا ممکن نہیں؟ احقر کا خیال ہے کہ حدیث میں متعارف ایام مراد ہیں اور اس میں کوئی استحالہ یا استبعاد نہیں ہے، بلکہ یہ مراد ہونے پر ایک واضح قرینہ بھی ہے، اور وہ یہ کہ حدیث میں دنوں کے متعارف نام: یوم السبت (سنیچر)، یوم الأحد (اتوار)، یوم الاثنین (پیر)، یوم الثلثاء (منگل)، یوم الاربعاء (بدھ)، یوم الخمیس (جمعرات) یوم الجمعۃ (جمعہ) وارد ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن میں مذکورہ "ستۃ أیام" کو ان ناموں سے موسوم نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ ان میں ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہے تو اس پر ان ناموں کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوا کہ حدیث میں ان متعارف دنوں کا ذکر ہے جن کی مدت قرآن کے ان "ایام" کے مقابلہ میں بہت ہی مختصر ومحدود ہے، جن میں کائنات کی تخلیق ہوئی۔

البتہ اس پر ایک شبہ وارد ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ سے اور بعض صحابہ وتابعین جیسے حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد سے منقول ہے کہ انہوں نے قرآنی "ستۃ ایام" کو اخروی ایام پر بھی محمول کیا ہے اور ان پر ان متعارف ناموں

کا اطلاق بھی کیا ہے۔

(۱) چنانچہ ایک حدیث میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ زمین وآسمان کی تخلیق کتنی مدت میں ہوئی ؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے تخلیق کی ابتداء دنوں میں سے پہلے دن ''یوم الاحد'' یعنی اتوار سے فرمائی اور ''یوم الاحد'' و''یوم الاثنین'' (اتوار و پیر) میں زمین پیدا کی گئی، اور ''یوم الثلا ثاء'' و''یوم الاربعاء'' (منگل و بدھ) میں پہاڑ پیدا کئے گئے، نہریں چلائی گئیں، اور زمین میں پھلوں کے پودے لگائے گئے، اور زمین کے ہر حصے میں اس کی غذائیں مقدر کی گئیں، پھر اللہ تعالی آسمان کی طرف متوجہ ہوئے جبکہ وہ دخان یعنی دھویں کی شکل میں تھا، اور فرمایا کہ اے زمین وآسمان! تم دونوں میرے پاس خوشی سے آؤ یا مجبور ہو کر آؤ، ان دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں، پھر اللہ نے دو دنوں ''یوم الخمیس'' و''یوم الجمعۃ'' (جمعرات و جمعہ) میں ان کے سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اپنا حکم جاری کیا، اور آخری تخلیق جمعہ کی آخری ساعات میں ہوئی ہے، پس جب ''یوم السبت'' (ہفتہ کا دن) ہوا تو کوئی تخلیق نہیں ہوئی، الخ۔ (۱)

(۲) ایک اور روایت میں ابن عباس ہی سے یہ ہے کہ یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور زمین وآسمان کی تخلیق کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا کہ اللہ نے زمین کو ''یوم الاحد'' و''یوم الاثنین'' (اتوار و پیر) میں پیدا کیا، اور اللہ نے پہاڑ کو اور اس کے اندر کے منافع کو ''یوم الثلا ثاء'' (منگل) میں پیدا کیا، اور ''یوم الاربعاء'' (بدھ) میں درخت، پانی، شہر اور آبادیاں اور ویرانیاں پیدا کی گئیں، پس یہ چار دن ہوئے، .... پھر اللہ نے ''یوم الخمیس'' (جمعرات) کو آسمان بنایا، اور ستارے، سورج، چاند، ملائکہ کو ''یوم الجمعۃ'' (جمعہ) کے دن کی تین گھڑی باقی تھے کہ پیدا کیا، پھر ان تین

(۱) مستدرک حاکم: ۲/۴۸۹

ساعات میں سے ایک میں موت کی مدتیں مقرر کیں اور دوسری گھڑی میں لوگوں کے نفع اٹھانے کی چیزوں پر آفت ڈالی اور تیسری گھڑی میں حضرت آدم کو بنایا، ان کو جنت میں رکھا، الخ۔(۱)

(۳) حضرت ابن عباس سے ایک روایت میں آیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ:

"إن اللّٰه خلق يوماً واحداً فسمّاه الأحد، ثم خلق ثانياً فسمّاه الاثنين ، ثم خلق ثالثاً فسمّاه الثلا ثاء ، ثم خلق رابعاً فسمّاه الأربعاء ، ثم خلق خامساً فسمّاه الخميس الخ۔ (اللہ تعالی نے پہلا دن تخلیق کیا اور اس کا نام احد (اتوار) رکھا، پھر دوسرا دن پیدا کیا اور اس کا نام اثنین (پیر) رکھا، پھر تیسرا دن پیدا کیا اور اس کا نام ثلثاء (منگل) رکھا ، پھر چوتھا دن پیدا کیا اور اس کا نام اربعاء (بدھ) رکھا اور پھر پانچواں دن پیدا کیا اور اس کا نام خمیس (جمعرات) رکھا)(۲)

(۴) اسی طرح امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں اپنی سند سے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ:

"بدأ الخلق العرش والماء والهواء ، وخلقت الأرض من الماء وكان بدأ الأرض يوم الأحد و الاثنين والثلاثاء والاربعاء ، وجمع الخلق فى يوم الجمعة ، وتهودت اليهود يوم السبت ، ويوم من الستة الأيام كألف سنة ممّا تعدون۔" (تخلیق کی ابتداء عرش، پانی، ہوا سے ہوئی اور زمین پانی سے پیدا کی گئی اور تخلیق کی ابتداء اتوار سے ہوئی، پھر پیر، منگل، بدھ، جمعرات میں تخلیق ہوئی اور تمام مخلوق جمعہ میں جمع کی گئی، یہود نے سنیچر کو توبہ کی، اور چھ دنوں میں سے ایک دن ہزار سال کے برابر ہے جو تم شمار کرتے ہو۔(۳)

ان میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابن عباس نے ان دنوں پر متعارف دنوں

(۱) مستدرک: ۵۹۲/۲ (۲) تفسیر طبری: ۸۷/۱۱، الدر المنثور: ۳۱۵/۷، فتح القدیر: ۲۴/۴ (۳) تفسیر طبریؒ: ۱۴۶/۵

کے نام کا اطلاق کیا ہے اور حضرت مجاہد نے ''ستة أيام'' میں ہر دن کوایک ہزار برس کے برابر بھی بتایا ہے اور پھر ان پر متعارف دنوں کے نام کا اطلاق بھی کیا ہے، تو کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ زیر بحث حدیث میں بھی ہوسکتا ہے کہ اسی طرح متعارف ناموں کا اطلاق اخروی دنوں پر کیا گیا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو یہ روایات قابل اطمینان نہیں ہیں اور ضعف کا شکار ہیں، کیونکہ:

(۱) پہلی روایت کو ابوسعید نے بغیر واسطہ ابن عباس کے مرسلاً روایت کیا ہے، جیسا کہ خود حاکم نے عبد الرزاق کے حوالے سے بیان کیا ہے، رہا حاکم کی روایت کا موصول ہونا تو عرض ہے کہ اس کی سند میں حسن بن اسماعیل بن صبیح یشکری ہے اور معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔ لہذا یہ جہالت راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(۲) دوسری حدیث کو اگر چہ حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے، مگر امام ذہبی نے اس پر یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ اس کے راوی ابوسعید البقال کے بارے میں ابن معین نے کہا کہ ان کی حدیث لکھی نہیں جائے گی۔ (۱)

میں کہتا ہوں کہ اس راوی کے بارے میں بعض نے توثیقی الفاظ استعمال کئے ہیں، مگر جمہور نے اس پر سخت جرحیں کی ہیں، ابن معین نے کہا کہ'' ليس بشيء، لا يكتب حديثه '' (یہ کچھ نہیں ہے اور اس سے حدیث نہیں لی جائیں گی)، عمرو بن علی نے کہا کہ ضعیف الحدیث، متروک الحدیث ہے، اور ابوزرعہ نے کہا کہ حدیث میں کمزور، مدلس ہے، ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ سچا ہے، تو فرمایا کہ ہاں جھوٹ نہیں بولتا، اور امام بخاری نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے، ابوحاتم نے کہا کہ اس کی حدیث سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا، نسائی نے کہا کہ ضعیف ہے اور دارقطنی نے کہا کہ متروک ہے۔ (۲)

(۱) تلخیص المستدرک: ۵۹۲/۲ (۲) تہذیب التہذیب: ۷۰/۴

(۳) تیسری حضرت ابن عباس کی روایت میں ایک راوی غالب بن غلاب ہے جو معلوم نہیں کہ کون اور کیسا شخص ہے؟

(۴) حضرت مجاہد کی روایت بھی ضعیف ہے؛ کیونکہ حضرت مجاہد سے اس کو نقل کرنے والے ابوبشر ہیں، وہ اگر چہ ثقہ ہیں مگر حضرت مجاہد سے ان کا سماع ثابت نہیں، بلکہ امامِ حدیث شعبہؒ نے وضاحت کی ہے:"لم يسمع منه شيئاً" (حضرت مجاہد سے ابوبشر نے کچھ نہیں سنا) اور اسی کی بنیاد پر جیسا کہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے امام شعبہؒ نے ابوبشر کی حضرت مجاہد سے روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔(۱)

لہٰذا یہ روایت منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دوسرے حضرت ابن عباسؓ سے ان ایام ستہ کے دوسرے نام مروی ہیں۔ چنانچہ روح المعانی میں بروایت ابن ابی حاتم وغیرہ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ان ایام کے یہ نام بتائے: ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفس، اور قریشات۔(۲)

تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ صرف تفہیم وتقریبِ اذہان کے لیے مجازاً انہوں نے ان ناموں کو استعمال کیا ہو، ورنہ متعارف نام ان ایام کے لیے استعمال نہیں کیے جاسکتے۔ کماھو ظاھر۔

اس لیے علامہ رشید رضاؒ نے یہ بتانے کے بعد کہ ایام ستہ کی تفسیر میں متعدد حضرات نے یہ کہا ہے کہ مراد اخروی دن ہیں، فرمایا کہ:"وهذا دليل على أنهم وإن سمّوا تلك الأيام بأسماء أيامنا فإنهم لا يعنون أنها منها۔" (یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات نے ان ایام اخروی کے لیے اگر چہ ہمارے دنوں کے نام ذکر کیے ہیں، مگر وہ یہ مراد نہیں لیتے کہ وہ ایام ان ایام سے ہیں)(۳)

---

(۱) تہذیب التہذیب لابن حجرؒ:۸۳/۲ (۲) روح المعانی:۱۳۳/۸ (۳) تفسیر المنار:۴۴۹/۸

غرض قرآن میں مذکوران ''چھ ایام'' کا حضرت نبی کریم ﷺ نے یا حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد نے یا کسی اور نے نام لیا ہے تو وہ مجازاً ہوگا، لیکن مسلم کی حدیث میں مذکور ناموں کو مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور جب تک مجاز کی ضرورت نہ ہو اور لفظ کو حقیقت پر محمول کیا جاسکتا ہو، مجاز مراد لینے کی اجازت بھی نہیں، لہٰذا مسلم کی زیرِ بحث حدیث میں جب ان متعارف ناموں کو متعارف دنوں پر محمول کیا جاسکتا ہے تو مجازاً ان کو ''اخروی ستۃ ایام'' پر محمول کرنے کی گنجائش ہی نہیں، خصوصاً جبکہ حدیث کو حقیقت ہی پر محمول کرنا متعین ہے جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

(۲) اس حدیث کے سلسلہ میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ حدیث میں ان سات دنوں میں جن چیزوں کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قرآن میں مذکور چیزوں کے مقابلے میں بہت ہی محدود و قلیل ہیں۔ چنانچہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ چھ دنوں میں ساری کائنات پیدا کی گئی ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ﴾ (زمین اور آسمان اور ان دونوں کی درمیان کی تمام چیزیں ان چھ دنوں میں پیدا کی گئیں) جب کہ حدیث یہ بتاتی ہے کہ: سنیچر کو مٹی، اتوار کو پہاڑ، پیر کو درخت، منگل کو مکروہ چیزیں، بدھ کو نور، جمعرات کو جانور اور جمعہ کو حضرت آدمؑ پیدا کیے گئے اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ منگل کو "تقن" (یعنی معاش کے ذرائع جیسے لوہا وغیرہ کذا فسرہ النوویؒ) اور بدھ کو مچھلی پیدا کی گئی۔ (۱)

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں نہ آسمان کا ذکر ہے اور نہ کسی آسمانی شئ کا ذکر ہے، صرف زمینی مخلوقات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی سب کا نہیں بلکہ چند مخلوقات کا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں پوری کائنات کی تخلیق کا اور اس کی تفصیلات

(۱) سنن النسائی الکبریٰ: ۶/ ۴۲۷؛ شرح مسلم للنوویؒ: ۲/ ۳۷۱

کا ذکر مقصود نہیں ہے۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو ظاہر ہے کہ بڑی بڑی تمام مخلوقات کا ذکر کیا جاتا جیسا کہ آسمان، سورج، چاند، ستارے، جنات، فرشتے، عرش وکرسی، لوح وقلم وغیرہ، اسی طرح زمینی بڑی مخلوقات جیسے، دریا، ہوا، پانی، آگ وغیرہ، مگر اس حدیث میں ان چیزوں کا نہ تفصیلی ذکر ہے، نہ اجمالی ذکر ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس زیر بحث حدیثِ پاک کا مقصد پوری کائنات کی تخلیق کا بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صرف بعض مخصوص چیزوں کے بارے میں یہ بتانا ہے کہ وہ کن کن دنوں میں پیدا کی گئی ہیں، اس کے برخلاف قرآن کا مقصد یہ بتانا ہے کہ چھ دنوں میں پوری کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض روایات میں چاند وسورج وغیرہ مخلوقات کا بھی ذکر آیا ہے جیسا کہ اوپر حضرت ابن عباس کی روایت گزری، تو جواب یہ ہے کہ اولاً تو وہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ ہم نے اوپر اس کی تحقیق کر دی ہے، دوسرے اس میں بھی تمام مخلوقات کا ذکر نہیں، بلکہ اس زیر بحث روایت کے لحاظ سے اس میں مزید کچھ اور مخلوقات کا ذکر ہے، مگر یہ تمام مخلوقات تو نہیں، دوسرے یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس روایت میں اگر تمام کا ذکر بھی ہے تو اس لحاظ سے کہ اس میں قرآنی چھ دنوں کا ذکر ہے، جن میں تمام مخلوقات کو پیدا کیا گیا تھا، مگر اس زیر بحث روایت میں قرآنی چھ دنوں کا نہیں، بلکہ سات دنوں کا ذکر ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس روایت میں سات دنوں میں پیدا کی جانے والی مخلوقات کا ذکر ہے، نہ کہ تمام مخلوقات کا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ حدیث میں ان ''ایام سبعہ'' میں جو مختلف چیزوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں یہ سمجھنا کہ تسلسل وترتیب بتائی گئی ہے، حدیث کے الفاظ کا نہ مفہوم ہے اور نہ اس کا منشأ ومقصود۔ حدیث سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں دن فلاں چیز پیدا ہوئی اور فلاں دن فلاں چیز وجود میں آئی،

اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ پہلے مٹی، پھر پہاڑ، پھر درخت، پھر مکروہات، پھر نور، پھر آدمؑ پیدا کیے گئے، یعنی ترتیب حدیث سے مفہوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان میں تسلسل کہ ہفتہ یعنی سنیچر کو مٹی کی پیدائش ہوئی تو فوراً ہی دوسرے دن اتوار کو پہاڑ پھر تیسرے دن فلاں اور چوتھے دن فلاں چیز پیدا ہوگئی، یہ بھی الفاظِ حدیث کا مقتضی نہیں ہے۔

بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سنیچر میں جس میں مٹی پیدا کی گئی، اور اس اتوار میں جس میں پہاڑ پیدا کیے گئے، مہینوں بلکہ سالوں کا فرق ہو، اسی طرح یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اتوار جس میں پہاڑ پیدا کیے گئے، مقدم و پہلے ہو اس سنیچر سے جس میں مٹی کی پیدائش ہوئی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس دوسرے دنوں اور چیزوں کو سمجھنا چاہئے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ زید و بکر دو بھائی ہیں اور زید بڑا ہے اور بکر چھوٹا، اور فرض کیجئے کہ زید کی پیدائش اتوار کو اور بکر کی سنیچر کو ہوئی، اب اس کا ذکر کرتے ہوئے کوئی یوں کہے کہ:

''بکر سنیچر کو پیدا ہوا اور زید اتوار کو پیدا ہوا''

تو اس جملہ کا مطلب و مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ بکر اور زید کی پیدائش کن کن دنوں میں ہوئی، اس کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا کہ بکر پہلے پیدا ہوا اور زید بعد، اور نہ یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ سنیچر سے متصلاً بعد والی اتوار کو زید پیدا ہوا۔

غرض یہ کہ اس جملہ سے نہ ترتیب نکلتی ہے اور نہ تسلسل مفہوم ہوتا ہے، اسی طرح حدیثِ زیرِ بحث میں بھی نہ ترتیب مفہوم ہوتی ہے اور نہ تسلسل کا پتہ، بلکہ یہ صرف بعض دنوں میں بعض امور کی پیدائش کی نشاندہی کرتی ہے۔

آخر سوچنے کی بات ہے کہ اگر ایک ہی دن کا نام لے کر کئی چیزوں کے اس میں واقع ہونیکی خبر دی جائے تو بھی ترتیب و تسلسل لازم نہیں آتا تو متعدد دنوں میں

متعدد امور کے ذکر سے ترتیب وتسلسل کیوں اور کیسے لازم آئے گا؟ مثلاً حدیث میں ہے کہ:

جمعہ کے دن حضرت آدمؑ کی پیدائش ہوئی اور جمعہ ہی میں وہ جنت میں داخل کئے گئے اور جمعہ ہی میں وہ جنت سے نکالے گئے۔اور بعض روایات میں اسی دن ان کی وفات کا ذکر بھی ہے۔(۱)

ظاہر ہے کہ کوئی بھی ان تمام واقعاتِ مذکورہ کوایک ہی جمعہ میں نہیں مان سکتا، بلکہ یہ واقعات متعدد جمعوں میں، مہینوں اور سالوں کے فرق وفصل کے ساتھ پیش آئے ہیں۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہود کو یومِ عاشوراء کا روزہ رکھتے دیکھا تو وجہ دریافت کی، انہوں نے کہا کہ یہ صالح دن ہے جس میں حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو اللہ نے فرعون سے نجات دی اور فرعون کو غرق کیا، اور اسی دن حضرت نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری تھی۔

اس حدیث کا پہلا حصہ (بخاری:۱/۲۶۸،مسلم:۱/۳۵۹،ابوداؤد:۱/۳۳۲) میں ہے اور دوسرا حصہ مسندِ احمد میں مزید ہے جیسا کہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔(۲)

ابن حجر نے اس پر سکوت کیا ہے جو حدیث کے صحیح یا حسن ہونے کی دلیل ہے، اور یہ خبر اگرچہ یہود کی ہے مگر حضور ﷺ کی تصدیق کی بناء پر حجت ہے۔ کمالا یخفیٰ۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ عاشوراء محرم میں جو دو واقعات کی خبر دی گئی ہے، یہ ایک ہی دن میں واقع نہیں ہوئے بلکہ دونوں کے درمیان طویل ترین مدت ہے۔

(۱) مسلم:۱/۲۸۲، ترمذی:۱/۶۷، ابواؤد:۱/۱۵۰، بیہقی: ۳/۲۵۱، مسند احمد : ۲/۳۱۱ وغیرہ (۲) فتح الباری:۴/۲۴۷

نیز حدیث میں پہلے موسیٰؑ وفرعون کے واقعہ کا پھر کشتی نوحؑ کے واقعہ کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ترتیب مراد نہیں، کیونکہ حضرت نوحؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے بہت مقدم ہے۔

غرض یہ کہ جب ایک ہی دن میں بتائے گئے واقعات میں ترتیب وتسلسل لازم نہیں تو حدیث زیر بحث میں ترتیب وتسلسل کیسے مفہوم ہوسکتا ہے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ:

(۱) حدیث میں جن سات ایام کا ذکر آیا ہے ان سے یہ ہمارے متعارف ایام مراد ہیں، جب کہ قرآن میں مذکور چھ دنوں سے یہ متعارف ایام نہیں بلکہ اخروی ایام مراد ہیں۔

(۲) حدیث میں کائنات کی تمام چیزوں کی تخلیق کا ذکر مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف چند چیزوں کے بارے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ چیزیں کن کن دنوں میں پیدا ہوئی ہیں جب کہ قرآن میں کل کائنات کی تخلیق کا ذکر مقصود ہے۔

(۳) حدیث میں جو سات ایام میں چند چیزوں کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ترتیب وتسلسل مفہوم نہیں ہوتا۔

ان وضاحتوں کے پیشِ نظر حدیثِ زیرِ بحث سے جو کچھ مفہوم ومعلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چند چیزوں کو ہمارے متعارف ایام کے مطابق ان دنوں میں پیدا کیا۔ مٹی کو سنیچر کے دن پیدا کیا، پہاڑوں کو اتوار کے دن وغیرہ، مگر ضروری نہیں کہ سنیچر کو مٹی کی پیدائش ہوئی تو اسی کے متصلاً بعد جو اتوار کا دن آیا اس میں پہاڑ بنائے گئے ہوں، اور نہ یہ ضروری کہ پہاڑ بعد میں اور مٹی پہلے پیدا ہوئی ہو جیسا کہ اوپر ثابت کر آیا ہوں۔

وجہِ تطبیق

جب آیتِ کریمہ اورحدیثِ شریفہ دونوں کی تشریح سامنے آگئی تواب یہ آسان ہے کہ ان دنوں میں وجہِ تطبیق وتوفیق معلوم کی جائے۔جیسا کہ ہم نے واضح کیا ہے آیتِ کریمہ میں چھ دنوں کی مدت سے مراداخروی چھ دن ہیں،اوراخروی ایک دن ایک ہزار برس کا ہے،تو یہ چھ دن ہمارے ایام کے مطابق چھ ہزار برس کے برابر ہوئے ،تو کل کائنات کی تخلیق چھ ہزار برس میں ہوئی۔یہ قرآن کا مفادومفہوم ہے۔

اورحدیثِ زیرِبحث میں سات دنوں کا ذکر جوآیا ہے، اس سے ہمارے یہ متعارف دن مراد ہیں جن میں سے ایک دن چوبیس گھنٹوں کا ہوتا ہے تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ چند چیزیں اللہ تعالی نے ان سات دنوں میں پیدا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دو باتوں میں یایوں کہہ لیجئے کہ ان قرآنی ستۃ ایام اوران حدیثی سبعۃ ایام میں کوئی تعارض وٹکراؤنہیں ہے؛ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین ، آسمان اورشمس وقمر پیدا کر کے دونوں کا متعارف نظام بنادیا ہو،پھر بقیہ اشیائے عالم میں سے کسی کو متعارف دنوں میں سے کسی دن اور کسی چیز کو کسی دن پیدا فرمایا ہو، اورتخلیق کا پوراعمل چھ ہزار برس تک جاری رہاہو۔اور نبی کریم ﷺ نے اس چھ ہزارسال کی طویل مدت میں سےصرف متعارف سات ایام کا ذکرفرماتے ہوئے یہ بتایا ہو کہ ان میں سے کس دن کونسی چیز پیدا ہوئی۔اورجیسا کہ واضح کر چکا ہوں یہ سات ایام پے درپے ومسلسل مراد ہونا بھی ضروری نہیں اور نہ ان چیزوں کی پیدائش میں ترتیب بتانا مقصودِ حدیث ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو چھ ہزار برس میں پیدا فرمایا اوراس مدت میں بےشمار متعارف ایام آئے اور گئے؛ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ نے

زمین وآسمان اورسورج کو بنا کر دنوں کا متعارف نظام قائم فرمادیا ہو، پھر بقیہ اشیاءِ کائنات کو تدریجاًان متعارف ایام میں پیدافرمایاہو،اورکسی دن کسی چیز کواورکسی دن دوسری چند چیزوں کو جیسا کہ خداتعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوا، پیدافرمایا گیا ہو۔ پس نبی کریم ﷺ نے چند مخصوص چیزوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ یہ فلاں فلاں دن پیدا کیے گئے۔

ظاہر ہے کہ اس تشریح وتوضیح پر حدیث وآیات میں جوتعارض محسوس کیا گیا، وہ سرے سے ختم ہوجاتا ہے۔قرآن کے ''ستة أيام'' بھی اپنی جگہ پر ہیں اور حدیث کے'' سبعة أيام'' بھی اپنی حالت پر برقرار ہیں۔حدیث کے سات دنوں کا قرآنی ستۃ ایام سے کوئی ٹکراؤنہیں ہوگا؛ بلکہ یہ حدیثی ''سبعۃ ایام'' قرآنی ''ستۃ ایام'' کاایک مختصر ومحدود جز وحصہ ہے؛ کیونکہ قرآنی ستۃ ایام ہمارے دنوں کے لحاظ سے چھ ہزارسال کے برابر ہیں۔اس اعتبار سے حساب کیجئے تو پتہ چلے گا کہ قرآنی چھ دنوں میں ہمارے یہ سات دن تین لاکھ بارہ ہزار دفعہ (۳۱۲۰۰۰) آتے ہیں، اس طرح کہ ہمارے ایک سال میں یہ سات دن جن کو ہفتہ کہا جاتا ہے،۵۲ دفعہ آتے ہیں، جب ایک سال میں ۵۲ دفعہ توایک ہزارسال میں ۵۲ ہزاردفعہ (۵۲۰۰۰) آئے،اور چھ ہزارسال میں تین لاکھ بارہ ہزاردفعہ آئے۔توقرآنی ستۃ ایام میں ہمارے سبعۃ ایام لاکھوں دفعہ آسکتے ہیں اورآتے ہیں۔تواگر نبی کریم ﷺ نے ان لاکھوں دفعہ میں سے ایک دفعہ کا ذکرکیا ہےتو یہ قرآنی ''ستۃ ایام'' کے معارض ومخالف کیوں کر ہوگیا؟

ایک مثال سے توضیح

اس کوایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے،وہ یہ کہ مدارس واسکولوں میں عام

طور پر تعلیمی وقت چھ گھنٹوں کا مقرر ہے، اور ان چھ گھنٹوں کو تقسیم کر کے انہیں آٹھ گھنٹے بنا لیے جاتے ہیں، اور ان آٹھ گھنٹوں میں سے ہر گھنٹہ ۴۵ منٹ کا ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ ایک آدمی یوں کہتا ہے کہ:

''ہمارے اسکول میں صبح سے شام تک تمام اسباق کے لیے چھ گھنٹے مقرر ہیں، پھر وہی یا کوئی دوسرا اسی کی تفصیل کرتے ہوئے یہ بتائے کہ پہلے گھنٹے میں صرف، دوسرے گھنٹے میں نحو، تیسرے گھنٹے میں تاریخ، چوتھے گھنٹے میں فقہ، پانچویں گھنٹے میں حساب، چھٹے گھنٹے میں انگریزی، ساتویں گھنٹے میں اردو واملا اور آٹھویں گھنٹے میں سائنس پڑھاتے ہیں۔''

تو کیا ان دونوں میں تعارض وتخالف ہے؟ نہیں، کیونکہ پہلے قول میں گھنٹے سے مراد ساٹھ منٹ والا گھنٹہ ہے اور دوسرے قول میں گھنٹے سے مراد وہ اصطلاحی گھنٹہ ہے جس کی میعاد ۴۵ منٹ ہوتی ہے۔ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔

اسی طرح قرآن میں مذکور چھ دنوں اور حدیث میں مذکور سات دنوں کو سمجھنا چاہئے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم)

نوٹ: یہ جو کچھ عرض کیا گیا کوئی ضروری نہیں کہ صحیح ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ سب کو اس سے اتفاق ہو، بلکہ اپنے غور وفکر کا یہ ایک نتیجہ ہے جو صواب وخطا دونوں کا احتمال رکھتا ہے، اور احقر کو اپنی بات پر بالکل اصرار نہیں، لہٰذا اگر دیگر علماء اس پر اپنی قیمتی رایوں سے مستفید فرمائیں گے تو بندہ بھی بحسنِ قبول ان سے استفادہ کرے گا۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

۲۲ رجب ۱۴۱۵ھ